علمی میدان میں ترقی کا چیلنج: سید ابو الحسن علی ندوی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

The Challenge of Growth in the Realm of Knowledge: Analytical Study of Syed Abu al Ḥasan ‘Ali Nadvi's Thoughts

Dr. Muhammad Abubakar Siddique
Research Associate, Islamic Research Index,
Allama Iqbal Open University, Islamabad
Email: muhammad.abubakar@aiou.edu.pk
ORCiD: 0000-0003-3160-5697

Abstract

The pursuit of knowledge has always been a defining element of human progress, particularly in Islamic civilization, where it played a crucial role in shaping intellectual and cultural advancements. However, the modern Muslim world faces significant challenges in sustaining intellectual growth while preserving its religious and cultural identity. This study explores the thoughts of Syed Abu al Ḥasan ‘Ali Nadvi, a prominent Islamic scholar, regarding the issue of intellectual stagnation and the pathways to intellectual resurgence. Through an analytical approach, this research examines Nadvi’s perspectives on the causes of stagnation in Muslim scholarship, his critique of Westernization, and his emphasis on a balanced synthesis of traditional and contemporary knowledge. His works, such as Māzā Khasira al-‘Ālam bi-Inḥiṭāṭ al-Muslimīn and Tārīkh-e-Da‘wat-o-‘Azīmat, provide profound insights into the need for intellectual revival through education, self-reformation, and adherence to Islamic principles.

Furthermore, this research paper delves into the complex interplay between traditional Islamic thought and the challenges posed by scientific development, as articulated by Nadvi. It employs an analytical lens to scrutinize his thoughts on the contemporary clash between scientific advancements and the foundational tenets of Islamic philosophy. The paper contextualizes the historical and philosophical backdrop of Nadvi's era, highlighting the rapid strides in scientific development and the ensuing intellectual challenges. Through a meticulous analysis of Nadvi's writings and speeches, the study explores his nuanced perspectives on addressing the dichotomy between faith and reason, tradition and modernity. It examines Nadvi's proposals for harmonizing scientific progress with Islamic principles, emphasizing the compatibility of the two. By assessing his viewpoints, this research seeks to provide a framework for overcoming the intellectual challenges of the Muslim world while maintaining a strong connection to its religious and cultural heritage.

Keywords: Syed Abu al Ḥasan ‘Ali Nadvi, Intellectual growth, Islamic scholarship, Scientific development, Educational reform, Traditional and modern synthesis, Muslim intellectual revival

علم کسی بھی تہذیب و تمدن کی بنیاد اور کسی قوم کی ترقی و تنزلی کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ دنیا میں وہی قومیں قیادت کے منصب پر فائز ہوتی ہیں جو علم و تحقیق میں کامیاب ہوتی ہیں، اور وہی زوال پذیر ہوتی ہیں جو علمی میدان میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں مسلم معاشرہ علم و دانش کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز رہا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فکری جمود، تقلید پرستی اور تحقیق سے دوری نے علمی انحطاط کو جنم دیا۔ جدید دور میں، مسلم دنیا کو علمی ترقی کے فقدان اور جدید و قدیم علوم میں توازن قائم رکھنے کے چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان مسائل کے حل کی جستجو ہر دور میں اسلامی مفکرین نے کی، اور اس ضمن میں سید ابوالحسن علی ندویؒ کی علمی و فکری کاوشیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ بیسویں صدی کے جید عالمِ دین، مفکر، مصلح اور ادیب تھے، جنہوں نے مسلمانوں کے علمی زوال اور اس کی وجوہات پر گہرائی سے غور و خوض کیا۔ ان کی علمی و فکری خدمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مسلم دنیا کو درپیش علمی چیلنجز کا جامع تجزیہ کیا اور اس زوال سے نکلنے کے لیے ایک متوازن اور عملی راہِ عمل تجویز کی۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ علمی ترقی کے لیے صرف سائنسی و تکنیکی علوم کا حصول کافی نہیں بلکہ اسلامی علوم، دینی فکر اور تہذیبی شناخت کو بھی برابر کی اہمیت دی جانی چاہیے۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی متعدد تصانیف میں علمی ترقی کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ ان کی چند اہم کتب درج ذیل ہیں:

1. **"ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"** – اس کتاب میں انہوں نے مسلمانوں کے علمی زوال کے اسباب اور اس کے عالمی اثرات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے علم و تحقیق کو ترک کیا اور اپنی تہذیبی اقدار کو نظر انداز کیا، تو دنیا میں ایک فکری خلا پیدا ہوا جس کا نقصان پوری انسانیت کو ہوا۔
2. **"نقوشِ اقبال"** – اس کتاب میں علامہ اقبال کے افکار کا تجزیہ کیا گیا ہے، خاص طور پر ان کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جو علم، خودی اور اجتہاد کے ذریعے مسلم امہ کی علمی ترقی پر زور دیتا ہے۔
3. **"تاریخ دعوت و عزیمت"** – اس میں اسلامی تحریکات اور ان کے فکری و علمی اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے علمی و فکری زوال کی وجوہات کیا ہیں اور کس طرح اس کا ازالہ ممکن ہے۔
4. **"العرب و الحضارۃ الاسلامیۃ"** – اس کتاب میں انہوں نے عرب تہذیب اور اسلامی علوم کی ترقی میں اس کے کردار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی علمی وراثت سے جڑنے کی تلقین کی ہے۔
5. **"مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"** – اس میں جدید مغربی تہذیب اور اسلامی فکر کے درمیان کشمکش کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلم دنیا کو علمی ترقی کے ساتھ اپنی دینی و تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنا ہوگا۔

ان کتابوں میں سید ابوالحسن علی ندویؒ نے نہ صرف علمی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی نشاندہی کی بلکہ ایک ایسا نظریاتی فریم ورک بھی پیش کیا جو جدید اور قدیم علوم کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اجتہاد اور تحقیق کی روح کو زندہ کرنے، نصابِ تعلیم کی اصلاح، اسلامی تعلیمات کو جدید سائنسی ترقی سے ہم آہنگ کرنے اور امت میں فکری خود اعتمادی پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلم امہ کے علمی ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی دینی اور فکری روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید علوم میں بھی مہارت حاصل کرے۔

یہ ریسرچ پیپر سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار کا تجزیہ کرے گا تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ ان کے نزدیک علمی ترقی کی کیا اہمیت ہے، مسلم معاشروں کو درپیش علمی چیلنجز کیا ہیں، اور ان سے نکلنے کے لیے وہ کیا حل تجویز کرتے ہیں۔ اس تجزیے کے ذریعے ہم نہ صرف ان کے افکار کی عصری معنویت کو سمجھ سکیں گے بلکہ مسلم دنیا کے علمی مستقبل کے لیے ایک مثبت اور عملی راہ بھی تلاش کر سکیں گے۔

علمی میدان میں ترقی

عصر حاضر کا ایک بڑا چیلنج علمی میدان میں ترقی ہے۔ غیر مسلم اقوام نے علمی میدان میں جو ترقی کی ہے اور جس طرح انہوں نے تجربے اور مشاہدے کو ذریعہ علم بنا کر نئے میدان تلاش کیے ہیں ان کا زمانہ معترف ہے۔ مغرب کے عروج کا زمانہ اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ ہے۔ حالات کے الٹ پھیر میں ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں اور اس میدان میں غفلت کی وجہ سے بہت سے مواقع ہم ہاتھ سے گنوا بیٹھے ہیں۔ لیکن اس دور میں اہل مغرب کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگی ہتھیاروں سے زیادہ علمی ہتھیار کی ضرورت ہے۔

علم ایک اکائی ہے اور اس پر کسی علاقے، قوم یا مذہب کی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ ایک فطری قانون ہے کسی بھی زمانے کی دریافت کسی ایک قوم کے لیے خاص نہیں رہی اور تمام عالم نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ یہ ایک الگ اور نمایاں حقیقت ہے کہ دنیا میں سیادت و قیادت انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جنہوں نے علمی تحقیقات کو پروان چڑھایا اور اہل علم کی سرپرستی کی۔ دنیا کی تمام تر تحقیقات انہی لوگوں کی مرہون منت ہیں جو شجر علم کی آب یاری کرتے رہے۔ مسلم دنیا کا المیہ یہ ہے کہ یہاں علمی میدان میں ترقی کی رفتار بہت کم ہے۔ داخلی و خارجی مسائل کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی کمزوریاں بھی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال مسلم دنیا کو اپنی روش پر غور و فکر کرنا چاہیے اور تحقیقی میدان میں اپنی نمایاں شناخت قائم کرنی چاہیے۔

علمی میدان کے موضوعات

مسلم دنیا میں تجدد کی تحریک نے مغرب سے درآمد شدہ ذخیرہ علوم متعارف کرایا ہے۔ مگر چند بڑے دماغوں کو چھوڑ کر باقی سب کے سب مغربی تہذیب کے نقیب ثابت ہوئے۔ انہوں نے بلد آہنگ کے ساتھ مغربیت کی طرف بلایا

اور اس کی رنگینیوں کو مزید نکھار کر امت کے سامنے پیش کیا تا کہ وہ اپنا آپ بھول کر مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس تحریک میں سب سے بڑا حصہ اہل عرب اور خاص طور پر مصری ادیبوں کا ہے جنہوں نے یورپی خیالات کو جدید عربی زبان میں پیش کیا۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

یورپ سے تعلیم پاکر آنے والے فضلاء کی یہ حالت تھی کہ مغربی روح ان کے اندر پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی کے پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر وہی خیالات و نظریات پورے یقین و وثوق اور پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے۔ دنیا کے کسی گوشہ میں اگر کوئی مستشرق، کوئی نظریہ یا خیالی تصور پیش کرتا مصر نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اس کا شارح و داعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا۔[1]

ایسے بہت سے موضوعات مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں جس میں مصری ادیبوں اور مستشرقین کا ایک ہی موقف ہے۔ مستشرقین کے سارے ہتھیار ان ترقی اپسند ادیبوں نے بھی استعمال کیے ہیں۔ الغرض مغرب سے متاثر ہو کر ان کے علوم کی درآمد کا پہلا مرحلہ کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ اس نے اسلامی بنیادوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور اہل عرب کو جاہلیت اولی کی طرف دعوت دی۔

ان ادیبوں نے مغربی فکر و فلسفہ کو بھی پوری طرح مشرقی سانچے میں نہیں ڈھالا۔ انہوں نے اگر اختیار کیا بھی تو مغربی ادبیات سے افسانہ نگاری، ڈرامہ، ناول اور فلسفے کے حوالے سے چند چیدہ و چنیدہ نظریات کو درآمد کیا یا پھر مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کی تائید و تصویب کی۔ حالاں کہ اگر ملک و ملت کی بھلائی مقصود ہوتی تو ادبیات سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں کے دیگر علوم، سائنس طبیعیات، حیاتیات، سوشل سائنسز کو درآمد کیا جاتا جس سے معاشرے کو نئے زاویوں سے سوچنے کا موقع ملتا۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "یہ اہل قلم اپنے ملک و ملت اور زبان و ادب پر بڑا احسان کرتے اگر یہ مغربی زبانوں کی ان کتابوں کو عربی میں منتقل کرتے جو سائنٹیفک علوم پر لکھی گئی ہیں اور جن سے عالم عربی کا کتب خانہ اب تک خالی ہے۔ جس طرح جاپان کے ادباء اور اہل قلم نے کیا اور اس کی بدولت اپنے اپنے ملک کو ایسا صنعتی ملک بنادیا جو طبعی اور صنعتی علوم میں یورپ کے بڑے ممالک سے آنکھیں ملا سکتا ہے۔"[2]

لیکن افسوس ہے کہ ان کی تمام تر توجہ اور دلچسپی کا مرکز صرف ادبیات، علوم عمرانیہ، فلسفہ، تاریخ، ناولیں، افسانے اور الحاد و بغاوت اور فکری انتشار کے داعیوں اور علم برداروں کی تصانیف تھیں جنہوں نے ان اسلامی ممالک میں بھی

ایک نیا فکری انتشار اور اخلاقی انار کی پیدا کر دی اور قومی شخصیت و کردار اور کمزور کر دیا اور یہاں افکار واقدار اور مکاتب فکر کی ایک نئی کشمکش پیدا ہو گئی۔

ان اقتباسات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان ادباء نے جن علوم کو منتقل کیا وہ نظری علوم ہیں۔ جن کے مباحث کبھی بھی ایک متفقہ نکتے پر نہیں پہنچیں گے۔ ہر جگہ حالات وزمانے کے پیش نظر جدا جدا راستے ہوں گے اور یہ ابحاث کبھی سر نہ کی جا سکیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علوم کو منتقل کیا جائے جن کی بنیاد پر اہل مغرب کو سیادت حاصل ہے۔ وہ سائنسی علوم منتقل کیے جائیں جن سے اہل مشرق کو فائدہ ہو۔ وہ علوم تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہوں تا کہ ان کی تصدیق کی جا سکے اور مزید نئے میدان تلاش کیے جا سکیں۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "لیکن دوسری طرف نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق عربی میں طبعی، میکانیکی اور ریاضیات کے میدان میں مجتہد قسم کے افراد مطلق نہ پیدا ہو سکے جن کی ان علوم میں برتری اور بالادستی اور ان کی تحقیقات اور علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اعتراف مغرب کو بھی کرنا پڑتا اور دنیا کے بین الاقوامی علمی حلقہ میں ان کو کوئی ممتاز مقام حاصل ہوتا۔"[3]

اہل دانش و بینش کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میدان میں اپنا فرض ادا کریں۔ مغرب میں رائج الوقت علوم کو درآمد کریں بالخصوص سائنسی علوم کو مقامی زبانوں میں منتقل کرنا اور ان علوم کی تدریس کا اہتمام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ البتہ جو خطرات سامنے آرہے ہیں ان کے تدارک کے لیے ان میں جزوی تبدیلی کی جا سکتی ہے تا کہ ان علوم کے منفی اثرات کو کم سے کم کیا جا سکے۔

پہلا چیلنج: اسلامی تصورات سے ہم آہنگ جدید تعلیمی نظام

مسلم ممالک میں دو طرح کے تعلیمی نظام رائج ہیں۔ پہلا تعلیمی نظام روایتی مذہبی تعلیم کا ہے جس میں دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور علوم القرآن اور علوم الحدیث کے ساتھ ساتھ دیگر روایتی علوم مثلاً عربی زبان و ادب اور فلسفہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ جبکہ دوسرا تعلیمی نظام جو جدید ضروریات سے ہم آہنگ ہے اور حالات کے مطابق طبعیات، حیاتیات اور بشری علوم پر مشتمل ہے۔ روایتی تعلیم مدارس میں اور جدید تعلیم کالجز، یونیورسٹیز میں دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک میں دونوں تعلیمی نظام برابر جاری و ساری ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک اسلامی ملک کے لیے دونوں طرح کی تعلیم ضروری ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ دونوں نظامہائے تعلیم متوازی چل رہے ہیں۔ یہ طبقاتی کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔ روایت پسندوں کی توجہ روایتی تعلیم کی طرف ہے اور جدید تعلیم سے پہلو تہی کرتے نظر آتے ہیں جب کہ جدت پسند جدید تعلیم کے حصول میں پوری کوشش کرتے ہیں اور روایت و روایتی تعلیم سے نالاں نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال قابل اطمینان نہیں ہے۔ مسلم

ممالک کو ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جو قدیم روایت سے جڑا ہوا اور جدید علوم و فنون سے ہم آہنگ ہو۔ درس گاہوں کی تقسیم سے معاشرے میں جو تقسیم پیدا ہو گئی ہے، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہے کہ اس دینی و دنیاوی تقسیم کا خاتمہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اشاعت علم کے لیے نہ صرف کفار سے مدد لی اور مسلمان بچوں کو بدر کے قیدیوں کے سپرد کیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ حکمت تو مؤمن کی گم شدہ میراث ہے، جہاں پائے اسے حاصل کرلے۔ جنگی فنون اور عسکری مہارتوں میں عہد نبوی میں زمانہ جاہلیت کی مہارتوں سے پورا فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ الغرض بے شمار حوالے ثابت کرتے ہیں کہ علوم و فنون کے حوالے سے اہل اسلام میں کبھی بھی تنگ نظری نہیں رہی۔ البتہ مسلمانوں کا ایک امتیاز ہمیشہ رہا ہے کہ انہوں نے علوم کو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ضرور کیا ہے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ زمانے میں ہمہ جہت تعلیم کی اہمیت ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔

دوسرا چیلنج: تعلیمی نظام میں اصلاح کی ضرورت

موجودہ تعلیمی نظام میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی "علمی منتشر اکائیوں میں وحدت و ربط" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> "علم کی کڑیاں بکھری ہوئی بلکہ بسا اوقات متضاد تھیں، علم طبیعیات و حکمت دین بر سر پیکار تھے حتی کہ ریاضی و طب جیسے معصوم علم کے ماہرین بھی بعض اوقات سلبی نتیجے نکالتے تھے چناں چہ یونان کے علماء یا تو مشرک تھے یا ملحد تھے اور یونان کے علوم اور مدارس فکر دین کے لیے خطرہ اور ملحدین کے لیے سند اور نمونہ بنے ہوئے تھے۔ اس صورت حال میں اسلام کا بڑا احسان تھا کہ اس نے ایک ایسی وحدت قائم کی جو تمام علمی اکائیوں کو مربوط کر دیتی تھی۔"[4]

مولانا ندوی نے جو خامی یونانی علوم میں نکالی ہے وہی خامی آج ہمارے تعلیمی نظام میں موجود ہے۔ روایتی دینی تعلیمی نظام اپنی بنیادی صورت میں خالص نظری بنیادوں پر قائم ہے جب کہ جدید تعلیمی نظام جدید تجربے اور مشاہدے پر قائم ہے مگر الحاد کا علم بردار ہے۔

تیسرا چیلنج: تعلیم میں الٰہ کا تصور

موجودہ دور میں لادینیت کی تحریک زوروں پر ہے۔ تعلیمی اصلاحات کا سب سے بنیادی جز اللہ کا تعارف ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام اس قابل ہو کہ وہ نئی نسل کو اللہ کا تعارف کروا سکے۔ اللہ کی معرفت اور یقین کامل ہی انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کامیابی کے ساتھ کسی اصول اور ضابطے کے تحت گزارے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

"آج یورپ اور امریکہ میں جو سانحہ اور المیہ پیش آیا وہ انسانی المیہ ہے کہ اس وقت ان کے ہاتھ میں باگ ڈور ہے دنیا کی، وہ اس کی قیادت کر رہے ہیں اور فکری قیادت کر رہے ہیں ،انہوں نے علم کا رشتہ اسم سے توڑ دیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، ضرورت اس کی تھی کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا جائے۔۔۔۔۔ ہماری ٹیکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں ہیں اور جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں ہمارے تحقیق کے مراکز ہیں سب اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں اور وہ اسم کو نہ بھولیں۔"[5]

چوتھا چیلنج: تعلیم اور سیرت و کردار سازی

تعلیمی اصلاحات میں دوسرا اہم انکتہ جس کی طرف توجہ دینا انتہائی ضروری ہے وہ تعلیم کے ساتھ تربیت اور کردار سازی ہے۔ ہماری جدید تعلیم اس مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کے لیے بے شمار سہولیات پیدا کی ہیں وہاں خود غرضی، مفاد پرستی اور نفسا نفسی کو بھی جنم دیا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں بے چینی اور انار کی پھیلی ہے۔ اور اقبال کے بقول:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

پانچواں چیلنج: تعلیم کے ساتھ ایمانی روح کی بیداری

تعلیمی نظام میں اہم ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام اسلامی تشخص کو مجروح نہ کرے۔ مولانا ندوی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بڑے مصلحین انگلستان کی نامور یونیورسٹیز سے پڑھ کر نکلے تھے مگر انہوں نے اس ماحول میں رہ کر وہاں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مغربی تہذیب اس قابل نہیں ہے کہ اس کی پیروی مشرق میں کی جائے۔ چناں چہ یہ لوگ جب ہندوستان واپس آئے تو یہاں کی قیادت کی۔ اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال اور مولانا محمد علی جوہر کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کہ یہ اعزاز مصر یا مشرق وسطی کے کسی ملک کو حاصل نہیں کہ انگلستان سے تعلیم یافتہ افراد نے مغربی تہذیب اور تمدن سے بغاوت کی ہو۔ بلکہ ایسے مسلمانوں کی بڑی تعداد مسلم دنیا میں مغربی تہذیب کو سہارا دینے میں پیش پیش رہی ہے۔

مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ قلب و دماغ دونوں کا مطمئن ہونا ضروری ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہو کہ طالب علموں کے دماغ کو بھی مطمئن کرے اور ان کے دل کو بھی مطمئن کرے۔ گویا فکر و نظر دونوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ دل مذہب کے ساتھ ہو اور دماغ الحاد کے ساتھ۔

چھٹا چیلنج: دینی و دنیاوی معاشرے کی تفریق کا خاتمہ

موجودہ دور میں ایک بڑی پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ دین دار اور دنیادار معاشرے کو الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے اتحاد کی کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی۔ ان دونوں کے افتراق کی وجہ سے ایک ایسی نسل نے جنم لیا ہے جو شدید فکری کشمکش کا شکار ہے۔ دین دار کہلانے والے طبقے کے بیش تر افراد جدید تقاضوں سے بے خبر اور دنیادار کہلانے والے دینی تقاضوں اور ذمہ داریوں سے بے خبر ہیں۔ ان کے دل اسلام کے ساتھ ہیں اور اسلام کو دنیا پر غالب دیکھنا چاہتے ہیں لیکن عملی طور پر ان میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

مسلم ممالک میں جو شدید کشمکش اور Confusion موجود ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ایک طبقہ دنیاداری کی طرف کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے خواہ دینی نسبت کمزور پڑ جائے اور دوسرا طبقہ خالص دین کی طرف لے جانا چاہتا ہے خواہ معاشرہ دیگر فنون سے خالی ہو جائے۔ اس کشمکش کے باعث امت مسلمہ کو بیرونی بدخواہوں کی ضرورت نہ رہی ہے۔ یہ دونوں طبقے آپس میں دست و گریباں ہیں۔

یہ تضاد تعلیمی نظام کے علاوہ دیگر چیزوں میں بھی موجود ہے۔ نوجوان گھر کا نقشہ کچھ اور دیکھتے ہیں۔ باپ دادا کی زبان سے اور کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ اسکول کالجز میں کچھ اور بتایا جاتا ہے۔ لٹریچر میں سبق کسی اور چیز کا ہے۔ ٹیلی ویژن اور ڈراموں میں الگ رنگ موجود ہے۔ منبر و محراب سے تعلق ہے تو وہ ایک الگ دنیا ہے۔ نوجوان اتنے تضادات میں گھرا ہوا ہے کہ اس کی شخصیت تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ بیک وقت نیکی کی طرف راغب ہے، اسلام کا علم بردار ہے، الحادی نظریات سے سیراب بھی ہو رہا ہے، غیروں کی تہذیب سے لگاؤ بھی رکھتا اور امت کا درد بھی اس کے دل میں جاگزیں ہے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے آرزومند بھی ہے۔

اس کشمکش میں جنم دینے والی نسل نہ تو اسلامی خود اعتمادی رکھتی ہے اور نہ ہی وہ ایمان کی لذت و حلاوت سے بہرہ ور ہے۔ وہ اقبال کا شاہین، مردِ مؤمن، خودی کے ہتھیار سے لیس بھی نہیں ہے۔

مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "ایک ایسا دماغی انتشار پیدا کر دیا ہے کہ فیصلہ نہیں کر پاتے، جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مشرق کی طرف لے جا رہا ہے، ایک مغرب کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس گاڑی اور گاڑی پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے، یہ تضاد سوسائٹی سے ہمارے نظام تعلیم سے ختم ہونا چاہیے۔"[6]

اس شدید کشمکش میں اہل علم کی ذمہ داری بنتی ہے وہ امت کی راہنمائی کریں۔ دین و دنیا دونوں کا احساس پیدا کریں اور امت کو اس بات پر قائل کریں کہ اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لیے دین و دنیا دونوں ناگزیر ہیں اور کسی ایک سے بھی پہلو تہی نہیں کی جاسکتی۔

اس مقصد کے لیے نوجوانوں کو ذہنی انتشار سے بچانے کی بھی کوشش کرنی ہوگی تاکہ ان کی شخصیت ٹوٹ بکھرنے سے بچ جائے۔ وہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنی اسلامی شناخت کو برقرار رکھ سکیں اور اسلام کے ساتھ اپنی وفاداری اور وابستگی پر فخر کر سکیں۔ اس سلسلے میں والدین اور معماران قوم کو بھی ایک دھارے میں لانا ضروری ہے تاکہ دونوں طبقات کا قبلہ و منزل ایک ہو اور وہ نئی نسل کو ایک رستے پر لے کر چل سکیں۔

ساتواں چیلنج: تحریک استشراق

عصر حاضر کے بڑے چیلنجز میں سے بہت بڑا چیلنج مستشرقین کا مقابلہ ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس نے مشرقی اسلامی علوم پر دسترس حاصل کی اور پھر انہیں تختہ مشق بنایا ہے۔ اس میں مثبت اور منفی دونوں طرح کی سوچ رکھنے والے غیر مسلم محققین شامل ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے حقائق کی جمع آوری میں کسی بد دیانتی سے کام نہیں لیا۔ جب کہ ایک بڑی تعداد ایسے اسلام دشمنوں کی ہے جنہوں نے اسلام دشمنی کے اظہار کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ کسی نے کم اور کسی نے زیادہ ہر شخص نے اپنی حیثیت کے مطابق حصہ ڈالا۔ کچھ نے اندر کے بغض کو بلا کم و کاست لکھ دیا تو کسی نے منصوبہ بندی کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے شامل کیا۔ کسی نے ببانگ دہل الزامات کی بوچھاڑ کر دی تو کسی نے تشکیک کے ہتھیار استعمال کیا۔ غرض بے شمار اسالیب سامنے آئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس طبقے کی طرف سے کئی بہترین تحقیقات بھی سامنے آئیں جنہیں اپنے مضمون میں استناد کی حیثیت حاصل ہے لیکن زیادہ تر ذخیرہ ایسا ہے جو برصغیر اور برطانیہ کی باہمی کشمکش کے تناظر میں آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے، سرکاری پالیسیوں کے راستے ہموار کرنے کی نیت سے تصنیف کیا گیا یا اس سے قبل تاریخ میں اسلام کی دعوت روکنے کے لیے غلط فہمیاں پھیلانے کی نیت سے کیا گیا۔

مستشرقین کا انداز تحریر

مستشرقین نے اسلامی تاریخ کو بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ اور منظم انداز میں نقصان پہنچایا ہے۔ ان کتب میں اعلی اور خالص علمی تحقیق اور غیر جانب داری کے نمونے بھی ملیں گے اور جھوٹی کہانیوں، توہمات، مفروضوں کی بنا پر قائم کیے گئے اندازے بھی ملیں گے۔ مغیبات کے تذکرے اور تشریح میں لایعنی تشریحات، وحی کی غیر معقول توجیہات کے ساتھ طنز و تعریض اور نفرت کا بالواسطہ و بلاواسطہ اظہار بھی ملے گا۔ مولانا ندوی مستشرقین کے اسلوب بارے رقم طراز ہیں:

"بہت سے مستشرقین کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے ایک مقصد متعین کر لیتے ہیں پھر ہر ممکن طریقے سے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ رطب و یابس معلومات (جن کا بعض اوقات موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا) و دینی، ادبی، اور تاریخی کتابوں بلکہ شعر و شاعری قصے کہانیوں مسخروں کی خوش گپیوں اور طنز نگاروں کی نگارشات سے خواہ وہ کتنی ہی سطحی اور بیہودہ ہوں معلومات اخذ کرتے ہیں پھر مکمل فن کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بنیاد پر ایسے علمی نظریات قائم کرتے ہیں جن کا ان کے ذہن و دماغ کے علاوہ کہیں وجود نہیں پایا جاتا۔"[7]

عموماً مصنف کی شخصیت کا مثبت تاثر برقرار رکھنے کی نیت سے چند مثبت باتوں کے بعد ایک آدھی منفی بات بھی لکھ دی جاتی ہے جس سے قاری کے دل میں مصنف کی انصاف پسندی اور حقیقت نگاری کا اچھا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مستشرقین نے اسباب نگاری کو بھی ایک فن کی شکل دے دی ہے۔ وہ واقعات کو غلط جامہ پہنانے کے لیے واقعات کو آپس میں اس طرح جوڑتے ہیں اور اسباب و علل کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ واقعے کی اہمیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

مستشرقین کی مستند کتب

مستشرقین کی بعض کتب اسلامیات میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں یہ کتب در اصل عرب کی قدیم و جدید تاریخ پر مشتمل ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو عربی ادب کے حوالوں کی روشنی میں بیان کیا گیا۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

A Literary History of Arabs (R.A.Nicholson)
History of Arabs (Dr. Phlip k Hitti)
The History of Arab Literature (Carl Brockelman)
Introduction to Islamic Theology and Law (Gold Ziher)

مستشرقین کی کتابوں کی تعداد کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے لیکن مندرجہ بالا کتب مستشرقین کا اصل منبع ہیں اور اس شعبے کی اہم ترین کتابیں کہلاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تحریک استشراق کے عمل کو اس قدر نظر انداز نہ کیا جائے کہ وہ تاریخ بدل ڈالیں۔ تاریخ اور سیرت نگاری کے شعبے میں مسلمانوں کو محنت کرنی چاہیے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

"مستشرقین کے منفی اثرات کا ازالہ کرنے کے لیے ۔۔۔۔ محققین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اور یجنل بحثیں تیار کریں اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل اعتماد معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات و حقائق سے روشناس کریں بلکہ ہم علمی اسلوب و اصول بحث، مجتہدانہ تحقیق اور دقت نظر، وسعت مطالعہ، مآخذ و مراجع کی صحت و استناد اور پر زور استدلال و استنتاج میں ان

پر بھی فوقیت لے جائیں اور ان غلطیوں اور علمی کمزوریوں سے بھی محفوظ ہوں جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں۔"[8]

مثبت اور تعمیری کام کی ضرورت

اہل دانش کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستشرقین کی نگارشات پر نظر رکھیں اور ان کی کڑی نگرانی کریں۔ ان کی تحریرات کا گہرا جائزہ لیں اور جہاں کہیں بد دیانتی سے کام لیا گیا ہو اس کی فوراً نشان دہی کریں۔ اس بات کا تنقیدی جائزہ لیں کہ ان کی تحقیق میں دیے گئے نتائج حقیقی ہیں یا مشنری جذبے کے تحت مصنوعی طور پر کشید کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں اس بات کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ مستشرقین کے مآخذ کیا ہیں؟ کن کتب کو حوالہ بنایا جارہا ہے، ان کتب کے استناد کو اچھی طرح پرکھا جائے۔

اسی نوع کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ مستشرقین پر تنقید کرتے ہوئے اعلیٰ معیار اختیار کیا جائے۔ مستشرقین کی تصانیف کے ردو قبول کا معیار طے کیا جائے۔ نہ تو ہر چیز کو رد کر دیا جائے اور نہ ہی ہر چیز کو بلاچوں چرا قبول کر لیا جائے۔ محض عبارت آرائی کے بجائے سادگی اور حسن بیان کو سامنے رکھا جائے۔ تنقید کے دوران جوابی طنز و تشنیع سے پرہیز کیا جائے کیوں کہ یہ علمی روش نہیں ہے اور اس سے انسان کے علمی وقار پر زد پڑتی ہے۔

قدیم علمی ذخائر تک رسائی کی کوشش

اہل اسلام کے قدیم علمی ذخیرے کا بڑا حصہ مغربی ممالک کی تحویل میں ہے۔ انڈیا آفس کی لائبریری سے ہندوستانی کتب کا کا ذخیرہ اور دیگر جرمن، فرانس اور برطانیہ کی لائبریریوں میں عرب مسلمانوں کی علمی باقیات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جن تک مسلمان محققین کی رسائی نہیں ہے۔

ان کتب تک رسائی اگر ہو جائے تو بہت سی گم شدہ باقیات مل سکتی ہیں۔ ابحاث دریافت ہو سکتی ہیں۔ مستشرقین کے جھوٹ پکڑے جاسکتے ہیں۔ تاریخی مغالطوں اور پیچیدگیوں کو حل کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ کی کاوش ہمارے سامنے ہے جنھوں نے صحیفہ ہمام ابن منبہ کا مخطوطہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور تاریخ ادب حدیث کی واقعیت کی زندہ مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ اہل دانش کو اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے کہ قدیم علمی ذخائر تک رسائی ہو۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

حوالہ جات

[1] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:148-147 ملخصًا

[2] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:150

[3] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:150

[4] ۔ انسانیت کی راہ نمائی میں اسلام کا عظیم کردار۔ ص:13

[5] ۔ انسانیت کے زوال کا سبب۔ ص:12

[6] ۔ دعوت فکر و عمل۔ ص:136

[7] ۔ اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین۔ ص:14

[8] ۔ اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین۔ ص:18، ملخصًا